سلسلۂ مطبوعات مجلس
۱۰۲

اسلام

ایک تغیّر پذیر دُنیا میں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "شعبۂ اسلامک اسٹڈیز" کے زیر اہتمام
ایک چار روزہ سیمنار منعقدہ ۲۲/تا ۲۵/جنوری ۱۹۷۷ء میں کی گئی
دو اہم افتتاحی و اختتامی تقریریں

مولانا ابوالحسن علی ندوی

بارِ دوم

۱۴۰۶ھ — ۱۹۸۵ء

کتابت ———— ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ———— لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس (آفسٹ)

صفحات ———— ۳۶

قیمت ————

باہتمام

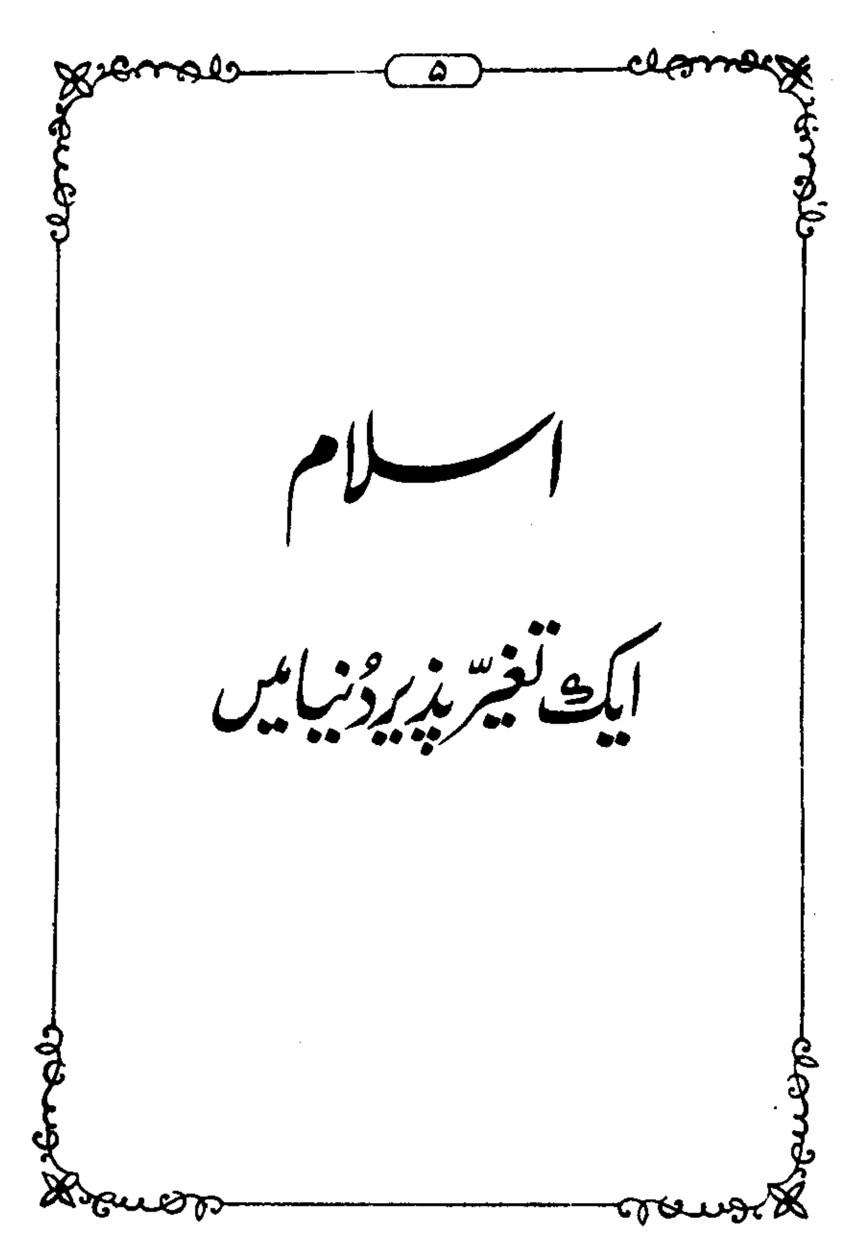
محمد غیاث الدین ندوی

طابع و ناشر

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

(ندوۃ العلماء)

فہرست



اسلام

ایک تغیّر پذیر دُنیا میں

پیش نظر تقریر

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ "اسلامک اسٹڈیز" کے زیر اہتمام "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" (ISLAM IN A CHANGING WORLD)

اس موضوع پر ایک چار روزہ سیمینار منعقد ہوا اس سیمینار میں ملک کے ممتاز علماء فضلاء اور دانشوروں کے علاوہ برصغیر کے چار مکاتبِ فکر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کے سربراہ، پروفیسر اے ایم خسرو (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) مولانا قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دار العلوم دیوبند) مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں (شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) بھی شریک تھے۔

سیمینار کے داعیوں اور منتظمین نے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی سے اس سیمینار کے افتتاح کی فرمائش کی، ۲۲ جنوری ۱۹۷۷ء کو دن میں دس بجے اس سیمینار کا افتتاحی جلسہ ہوا، جناب علی محمد خسرو (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے جلسہ کی صدارت کی مسلم یونیورسٹی کا وسیع کینیڈی ہال سامعین سے پر تھا لوگوں کی بڑی تعداد نے کھڑے ہو کر تقریر سنی، سامعین میں سیمینار میں آئے ہوئے ملک کے مختلف علاقوں کے مندوبین کے علاوہ جناب بدر الدین طیب جی (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے سربراہ، اساتذہ اور طلباء بھی شریک تھے مجمع نے کامل توجہ اور سکون سے اس تقریر کو سنا اور تحسین کی، یہ تقریر ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے دانیال احمد بھٹکلی ندوی نے قلم بند کی، تقریر کی نظر ثانی کے بعد افادۂ عام کی غرض سے اس تقریر کو کتابچے کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

۲۵ فروری ۱۹۷۷ء (اسحاق جلیس ندوی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب وائس چانسلر صاحب، اساتذۂ جامعہ، فضلائے مجلس اور معزز حاضرین!
میں سب سے پہلے اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ اس سمینار کے داعیوں کا شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے مجھے ایسی مؤقر مجلس کے افتتاح کے لئے جس کا ایسا سنجیدہ اور فکر انگیز عنوان ہے، دعوت دی اور عزت بخشی۔

بڑی ذمہ داری

حضرات! یہ بڑی موزوں اور برمحل بات ہے کہ یہ سمینار مسلم یونیورسٹی کے حلقے میں اور اس کے زیر سایہ منعقد ہو رہا ہے جس نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے بدلتی ہوئی دنیا اور تغیر پذیر عہد کا سب سے زیادہ جرأت مندانہ اور واضح طور پر نوٹس لیا، لیکن تغیر کی حقیقت کو تسلیم کرنے والے اداروں اور تحریکوں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، تغیر اور تبدیلی کی ضرورت کا تسلیم نہ کرنا آسان ہے، اس سے کوئی ذمہ داری اس ادارے اور اس تنظیم پر عائد نہیں ہوتی، جو تغیر سے انکار کر دیتا ہے، مگر تغیر کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے بعد تو ادارہ ہمیشہ کے لئے اس کا ذمہ دار ہو جاتا ہے کہ حالات کا دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیتا ہے، اور دیکھے کہ

نئے تغیر کی حقیقت کو تسلیم کرنے اور اس کا سامنا کرنے کے لئے وہ تیار ہے یا نہیں؟
اس حیثیت سے مسلم یونیورسٹی پر اور اس کے بعد ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور یہ حسن اتفاق ہے کہ ان دونوں اداروں کے ذمہ داروں کا یہاں ایک سنگم ہو رہا ہے، ان کو خود زمانے سے پہلے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ایک مرتبہ تغیر کو قبول کر لینے کے بعد پھر کیا وہ کسی جائز تغیر کو قبول کر لینے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟

زمانہ ثبات و تغیر کا نام ہے

حضرات! آج کا عنوان ہے "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" اس کے دو جز ہیں، ایک تو "اسلام" اور ایک "تغیر پذیر دنیا" میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں کے بارے میں اپنے ناچیز خیالات پیش کروں اور ہم آپ ایک کھلی ہوئی فضا میں کھلے ہوئے دماغوں کے ساتھ اس پر غور کریں۔

زمانہ اپنی تغیر پذیری اور زیادہ صحیح الفاظ میں اپنی تغیر پرستی یا اقبال کے الفاظ میں "تازہ پسندی" کے لئے بدنام زیادہ ہے اور بدکم ہے، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیری ہی کا نام ہے اس میں کوئی ٹھہراؤ نہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، زمانہ ثبات اور تغیر کے متوازن، مرکب اور مجموعے کا نام ہے۔

جب کبھی اس کا تناسب بگڑ جائے گا یعنی ٹھہراؤ تغیر پر غالب آجائے گا یا تغیر ٹھہراؤ پر غالب آجائے گا تو زمانے، سوسائٹی اور تہذیب کا قوام بگڑ جائے گا، ان دونوں کے تناسب

کا معاملہ کیمیاوی اجزاء کے تناسب سے بھی کہیں زیادہ نازک ہے، زمانہ جہاں تغیر کی صلاحیت رکھتا ہے، اور اس کو بدلنا چاہیئے اس لئے کہ بدلنا زندگی کی کوئی کمزوری کمی یا عیب نہیں، وہ زندگی کا عین مزاج ہے، اور زندگی کی تعریف ہے ؎

ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

وہ زندگی، زندگی کہلانے کی مستحق نہیں جس میں نمو کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہو، وہ درخت شاداب اور پر ثمر نہیں کہلایا جا سکتا جو اپنی نمو کی صلاحیت کھو دے۔

تغیر پذیری یا اس کے بجائے اگر آپ اس کو نمو یا ترقی کا نام دیں تو میرے خیال میں آپ اس کے ساتھ زیادہ انصاف کریں گے۔

زمانہ تغیر قبول کرنے کے ساتھ مقابلے کی بھی ایک طاقت رکھتا ہے، ہم یہ تو دیکھتے ہیں کہ زمانہ کتنا بدل گیا اور اس تبدیلی کے مظاہر بھی ہم کو صاف نظر آتے ہیں لیکن زمانے نے اپنی اندرونی صلاحیتوں کو باقی رکھنے اور اپنے صالح اجزاء و عناصر کو محفوظ رکھنے کے لئے کتنی کشمکش کی اور کس قوتِ مقابلہ سے کام لیا، عام حالات میں ہم اس کو نہیں دیکھ پاتے اس کے لئے ایک خاص طرح کی خوردبین کی ضرورت ہے۔

ایک دریا ہی کو آپ لیں جو روانی اور حرکت کے لئے سب سے بہتر مثال ہو سکتا ہے، دریا کی کوئی موج اپنی پہلی موج کی بالکل عین اور مماثل نہیں ہوتی لیکن دریا اپنی گذرتی ہوئی موجوں کے باوجود اپنے نام کے ساتھ اپنے حدود کے ساتھ اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ ہزاروں برس سے قائم ہے، دجلہ و فرات آج بھی دجلہ و فرات

کہلائیں گے، اور گنگ وجمن آج بھی گنگ وجمن کہلاتے ہیں۔

زمانے کے اندر ٹھہراؤ بھی ہے، اور بہاؤ بھی، اگر زمانہ ان دونوں خصوصیتوں اور صلاحیتوں میں سے کسی ایک سے محروم ہو جائے تو وہ اپنی افادیت کھو دے گا۔

اسی طرح کائنات میں جتنے بھی وجود، شخصیتیں اور ہستیاں ہیں، سب کے اندر مثبت اور منفی لہریں برابر اپنا کام کرتی رہتی ہیں ان دونوں لہروں کے ملنے سے وہ فریضہ ادا ہوتا ہے، اور وہ منصب پورا ہوتا ہے، جو ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

مذہب زندگی کا نگراں ہے

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، مذہب کے ایک پیرو اور طالب علم کی حیثیت سے میں مذہب کے لئے یہ پوزیشن قبول نہیں کر سکتا اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات بھی مذہب کے لئے یہ پوزیشن نہیں پسند کریں گے کہ مذہب ہر تغیر کا ساتھ دے یہ کسی تھرما میٹر کی تعریف تو ہو سکتی ہے کہ وہ :۔

درجۂ حرارت و برودت بتلائے یہ مرغ بادنما (WEATHER COCK) کی بھی تعریف ہو سکتی ہے جو کسی ہوائی اڈے یا اونچی عمارت پر لگایا گیا ہے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہوا کس طرف کی چل رہی ہے، لیکن مذہب کی تعریف نہیں ہو سکتی، میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا کہ

مذہب کو اس کے بلند مقام سے اتار کر نظر امیٹر یا مرغ باد نما کا مقام دینا چاہتا ہو کہ مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ صرف زمانے کی تبدیلیوں کی رسید دیتا رہے، اکنالج (ACKNOWLEDGE) کرتا رہے یا اس کی عکاسی کرتا رہے، صحیح آسمانی مذہب کے تو کیا کسی نام نہاد مذہب کے پیرو یا اس کے نمائندے بھی اس پوزلیشن کو قبول کر لینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

مذہب تغیر کو ایک حقیقت مانتا ہے، اور اس کے لیے وہ ساری گنجائش رکھتا ہے، جو ایک صالح، صحیح، فطری اور جائز تغیر کے لئے ضروری ہوں، مذہب زندگی کا ساتھ دیتا ہے لیکن یہ محض ساتھ دینا یا محض رفاقت اور پیروی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کا فرق کرے کہ یہ صالح تغیر ہے، اور یہ غیر صالح تغیر ہے، تخریبی رجحان ہے، اور یہ تعمیری رجحان ہے، اس کا نتیجہ انسانیت کے حق میں یا کم سے کم اس مذہب کے پیرؤں کے حق میں کیا ہوگا؟ مذہب جہاں رواں دواں زندگی کا ساتھ دینے والا ہے، وہاں وہ زندگی کا محتسب، نگراں، گارجین (GUARDIAN) اور زندگی کا اتالیق بھی ہے گارجین کا کام یہ نہیں ہے کہ جو ہستی اس کی اتالیقی میں ہے، اس کے ہر صحیح غلط رجحان کا ساتھ دے اور اس پر مہر تصدیق ثبت کرے، مذہب ایسا سسٹم نہیں ہے کہ جہاں ایک ہی قسم کی مہر رکھی ہوئی ہے، ایک ہی طرح کی روشنائی ہے، اور ایک ہی طرح کا ہاتھ ہے، جو دستاویز اور تحریر آئے مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کر دے۔

مذہب پہلے اس کا جائزہ لے گا، پھر اس پر اپنا فیصلہ صادر کرے گا، اور ترغیب کے اور بعض اوقات مجبوراً ترہیب کے ذریعہ اس سے اسے باز رکھنے کی کوشش کرے گا اور اگر کوئی ایسی غلط دستاویز اس کے سامنے آئی ہے جس سے اس کو اتفاق نہیں یا جس کو وہ انسانیت کے حق میں مہلک اور تباہ کن سمجھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کرے گا، بلکہ اس کی بھی کوشش کرے گا کہ وہ اس کی راہ میں مزاحم ہو۔

یہاں اخلاقیات اور مذہب میں ایک فرق پیدا ہو جاتا ہے، مذہب اپنی ذمہ داری اور فرض سمجھتا ہے کہ غلط رجحان کو روکے، ماہر اخلاقیات و نفسیات کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ غلط رجحانات کی نشاندہی کر دے، یا اپنا نقطۂ نظر ظاہر کر دے لیکن مذہب اس کی کوشش کرے گا کہ وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے۔

مذہب کی تاریخ کی بعض آزمائشیں

مذہب کی تاریخ میں ہمیں بعض وقفے نظر آتے ہیں، یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اور زندگی کا ساتھ چھوٹ گیا ہے، وہاں مذہب سے زیادہ پیروان مذہب اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں، جو مذہب کے اعلیٰ اصول، عملی زندگی میں جاری اور ساری کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں، یہ مذہب کی کوتاہی نہیں کہ وہ زندگی کا ساتھ نہیں دیتا، یہ پیروانِ مذہب کی کوتاہی ہے کہ وہ اپنی سستی اور کوتاہی سے زندگی کے قافلے سے بچھڑ جاتے ہیں، لیکن

مذہب اور پیروان مذہب کا ایسا مستحکم رشتہ اور نازک تعلق ہے کہ ان دونوں کے درمیان بہت کم نگاہیں فرق کر سکتی ہیں کہ یہ کوتاہی مذہب کی ہے یا پیروان مذہب کی تاہم ایک عظیم ادارے اور ایک عظیم تحریک کے علمبردار حقیقت پسندانہ، ناقدانہ اور مذہبی علمی اور گروہی عصبیتوں سے علیحدہ ہو کر تاریخ کا بے لاگ غیر جانبدارانہ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اسلام بحیثیت دینی اور آسمانی تعلیمات کے اس کا ذمہ دار نہیں تھا اور اس کے اندر کوئی ایسا نقص موجود نہیں تھا، جو اس کو زندگی کا ساتھ دینے اور اس کے مسائل حل کرنے سے باز رکھے۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب

انسانوں کی پرانی کمزوری ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دیتے ہیں جب بہت سے مسلمانوں سے قرآن مجید کی روشنی میں مسائل حاضرہ کے حل کرنے اور اپنی محنت و ذہانت سے قرآن مجید کے رہنما ابدی اصولوں اور بدلتی ہوئی زندگی کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں کوتاہی ہوتی ہے تو وہ اپنے قصور کا اقرار کرنے کے بجائے قرآن مجید پر زندگی کے ساتھ نہ دے سکنے کا الزام لگاتے ہیں، یا مخالفین کو یہ تأثر دیتے ہیں کہ قرآن مجید معاذ اللہ ناقص ہے، اس لئے کہ وہ ان کی ہر خواہش اور ہر ضرورت کے لئے سندِ جواز مہیا نہیں کرتا، علامہ اقبالؔ نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

بعض لوگ اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر خود قرآن مجید کو اپنی خواہشات اور اپنی کمزوریوں اور بے اصولیوں کا تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اس کی ایسی تفسیر کرنے لگتے ہیں جس سے ان کی غلط زندگیوں کا جواز نکلے، وہ اپنے کو قرآن مجید کے سانچہ میں ڈھالنے کے بجائے قرآن مجید کو اپنے فکر و عمل کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مقدمۂ تفسیر میں اپنے مخصوص ادیبانہ اور بلیغ انداز میں اس صداقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"انھوں نے جب دیکھا کہ وہ قرآن مجید کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو انھوں نے اس کو اس کی بلندیوں سے نیچے اتارنے کی کوشش کی تاکہ وہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے"

باصلاحیت افراد کی کمی

وہ سارے وقفے جس میں ہمیں مذہبی حلقے پر جمود طاری نظر آتا ہے یا پیروانِ مذہب کی زندگی میں الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں، یہ ان باکمال شخصیتوں کے فقدان یا کمی کا دور ہے، جو زمانے کے چیلنج کو قبول کر کے مذہب کی مؤثر نمائندگی کرتے ہیں، اسلامی تاریخ کے جس دور میں بھی مذہب کی بہتر نمائندگی ہوئی اسلام اور شریعتِ اسلامی پر معاشرے میں کبھی بھی بے اعتمادی نہیں پیدا ہوئی، اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمیں

زمانے کی سطح سے بلند ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں، جنھوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیت اور عبقری (GENIUS) شخصیت سے اپنے دور کے فتنوں کا سدِ باب، اپنے زمانے کے پیدا شدہ نئے مسائل کے حل اور مذہب کی طاقت و رہنمائی اور زندگی کا فریضہ نہایت کامیابی سے انجام دیا، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اس دور میں پیدا ہوئے، جب ان کی ضرورت دین اور زمانے کو تھی، انھوں نے اسلامی شریعت و قانون کو منقح شکل میں پیش کر کے اسلامی سلطنت کی وسعت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کیا، بعد کے دور میں امام ابو الحسن اشعریؒ اور امام غزالیؒ جیسے عالی دماغ افراد آئے اور انھوں نے ان خطرات اور فتنوں کا مقابلہ کیا جو ان کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔

آسان اور پُر پیچ

حضرات! اگر آپ غور فرمائیں تو بات بہت آسان اور قابلِ فہم ہے، لیکن اگر صرف منطقی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے مسئلہ سمجھنا چاہیں تو اچھا خاصہ معمہ بن سکتا ہے، بات بہت سادہ ہے، اور بہت آسان ہے اور بہت مشکل اور پُر پیچ بھی ہے، سادہ اس طرح ہے کہ پہلے آپ زمانے کی حقیقت کو سمجھ لیں کہ زمانہ اس طرح تغیر پذیر نہیں کہ اس کی سرعت کا نہ نظامِ اخلاقیات ساتھ دے سکتا ہے، اور نہ کوئی نظامِ فکر، زمانے کی حقیقت ہم سمجھیں اور زمانے کا جو اصل مقام ہے، اس کے ادراک کی

کوشش کریں اور اس کے ساتھ ہم اسلام کو سمجھیں اور اس کا گہرا مطالعہ کرکے دیکھیں کہ قرآن مجید میں رہنمائی کے کیسے ابدی اصول دیئے گئے ہیں، اس میں زندگی کے تغیر کا کتنا اعتراف کیا گیا ہے، اور عقل وفہم سے کام لینے کی کیسی دعوت دی گئی ہے، ہم دیکھیں کہ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے جن کو پہلی مرتبہ نئی نئی تہذیبوں اور فلسفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا کس خوبی سے اپنی ذمہ داری پوری کی۔

عہد جدید کا ساتھ دینا کیا معنی، میں اس کو اسلام کی پوزیشن سے فروتر بات سمجھتا ہوں، اسلام تو عہد جدید کی رہنمائی کرسکتا ہے، اور اس کو راہِ راست پر بھی لگا سکتا ہے۔

عہد جدید خودکشی پر آمادہ

حضرات! اگر آپ یہ بھی دیکھیں کہ عہد جدید کس مہلک غار کی طرف جارہا ہے؟ کس طرح خودکشی پر آمادہ ہے؟ اور انسانیت کے لئے پیامِ موت بن رہا ہے؟ نسلِ انسانی کی افادیت کے خلاف خدا کی عدالت میں ثبوت پیش کررہا ہے کہ انسان کو زندہ رہنے کا حق نہیں؟ کیسے کیسے تخریبی رجحانات اس میں کام کررہے ہیں؟ اسلام اپنے ان اصولوں کے ذریعہ جو قرآن مجید میں مذکور ہیں، خواہ وہ اخلاقی ہوں یا تمدنی، خواہ افراد کے باہمی رشتوں سے تعلق رکھتے ہوں یا ان کی خارجی زندگی سے، ان اصولوں کے ذریعے عہد جدید کے نہ صرف جائز تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے، بلکہ عصر جدید کو

اس تناہی سے بھی بچا سکتا ہے، جو تلوار کی طرح اس کے سر پر لٹک رہی ہے:۔

اب مسئلہ عصر جدید کا ساتھ دینے اور نہ دینے کا نہیں رہا اب تو عصر جدید کے بچانے کا مسئلہ سامنے آیا ہے، اب تو عہد جدید کی بات کرنے والوں، عصر جدید کے قصیدہ خوانوں، عہد جدید کی دہائی دینے والوں اور عہد جدید کے نام پر ایسے سیمنار بلانے والوں کا ہے کہ وہ بھی رہیں گے یا نہیں رہیں گے؟ اس نقارخانے میں ان کی آواز بھی سنی جائے گی، جہاں صرف پیٹ اور نفس امارہ کی پرستش ہو رہی ہو؟ آج دنیا میں اور خود ہمارے ملک میں دو ہی حقیقتیں زندہ نظر آتی ہیں، ایک دولت، دوسری قوت، کیا ایسے زمانے میں کسی سنجیدہ علمی حقیقت پر غور کیا جا سکے گا؟ اور کیا انسان اس موڈ میں ہوں گے کہ کوئی سنجیدہ بات ان سے کہی جا سکے؟ یہاں تو صرف ایک نعرہ ہوگا کہ بہتی ہوئی گنگا ہے اپنا اپنا ہاتھ دھو لو اور اپنی اپنی جھولی بھر لو، کوئی اخلاقی حدود، کوئی بلند معیار، کوئی انسانی خیر خواہی کی بات اور تہذیب کو بچانے کا مسئلہ قابلِ فہم نہیں رہے گا، لوگ اس موڈ ہی میں نہیں ہوں گے۔

اب تو اسلام کے بجائے عہد جدید کو بچانے کا مسئلہ زیادہ اہم ہے، آپ اس عہد جدید کی خبر لیجیے جو اتنا بد مست ہو چکا ہے کہ کوئی سنجیدہ بات سُننا

نہیں چاہتا، آپ اسلام کی طرف سے اطمینان رکھئے وہ ہر عہد اور تمام جائز تقاضوں کو تسلیم کرتا ہے، اس سے زیادہ انصاف پسند کوئی نظام نہیں، جب بھی کوئی مظلوم آواز یا انسانی فریاد بلند ہوئی تو اسلام نے اس کی طرف توجہ کی، اس نے ہمیشہ عقلِ انسانی کو سرگرمِ کار رہنے کی دعوت دی، علی گڑھ یونیورسٹی اور عربی مدارس کے لئے چھٹی ہے، جمعہ کی چھٹی ہو یا اتوار کی چھٹی، لیکن عقل انسانی اور عقلِ ایمانی کو بھی چھٹی نہیں، اس نے کہا کہ اہلِ علم کے لئے سب سے زیادہ قربانی کی ضرورت ہے، اور سخت سے سخت معیار زندگی گذارنے کے لئے اپنے کو تیار رکھنا چاہئے۔

غلط تشریح سے غلط فہمیاں

بہت سی غلط فہمیاں غلط تشریح سے پیدا ہوتی ہیں، حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا یہ کتنا حکیمانہ مقولہ ہے "كلموا الناس على قدر عقولهم أتريدون ان يكذب الله ورسوله" لوگوں کی عقل کے مطابق بات کرو، دینی حقائق کو اس انداز میں پیش کرو کہ ذہن اس کو قبول کرے، یہ مسئلہ صرف الفاظ کا نہیں بلکہ اسلوب، طرزِ فکر اور طریقۂ بیان کا بھی ہے، اس کے بعد فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کی تکذیب کی جائے، خدا اور رسولؐ کی تکذیب اس لئے نہیں کی جا رہی ہے کہ خدا اور رسول کی باتیں زمانے کے حقائق کے خلاف ہیں، بلکہ اس لئے کی جا رہی ہیں کہ ان کو دل نشین اور قابلِ فہم طریقہ پر پیش نہیں کیا جاتا ہے۔

اسلام تغیر پذیر دنیا میں اپنا مقام رکھتا ہے، یہ مقام کوئی ایسا نہیں کہ وہ آپ سے رحم کی درخواست کرے کہ اس کو باقی رہنے دیا جائے، بلکہ زندگی اسی کی نگرانی و رہنمائی میں صحیح راستے پر چل سکتی ہے۔

مذہب اور تہذیب

اس موقع پر ذہن میں تہذیب کا تصوّر آتا ہے، یہ ایک مغربی تخیّل ہے، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک گذشتہ تہذیب کا نام ہے، اسلام پر لکھنے والے مصنفین "LEGACY OF ISLAM" کا عنوان دیتے ہیں، اسلام ایک تہذیب ضرور رکھتا ہے لیکن وہ محض ایک گذشتہ تہذیب کا نام نہیں ہے، تہذیب کے لئے ہم جانتے ہیں کہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہزار برس پہلے کی تہذیب یا پانچ سو برس پہلے کی تہذیب کا اس بدلی ہوئی دنیا میں کوئی جواز ہے لیکن مذہب صرف اخلاقی قدروں محض کسی معاشرت، رہن سہن کے طریقے، تہذیب اور فنِ تعمیر کا نام نہیں، وہ تو غیبی حقائق، ایمانی عقائد اور ایمانیات کا مسئلہ ہے، وہ عبد و معبود کے باہمی رشتے اور زندگی گذارنے کے ابدی آسمانی اصولوں کا نام ہے۔

اگر اسلام کا یہ دائرہ ہے تو اسلام کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے کہ سانچے بدل جائیں گے تو وہ ان سانچوں میں فٹ ہو سکتا ہے یا نہیں مغربی مصنفین خلطِ مبحث کرتے ہیں، زندگی چاہے کتنی ہی بدل جائے ان ابدی حقائق و عقائد

کے لئے جگہ اور گنجائش ہے، اور پوری زندگی اس کے سائے کے نیچے آنی چاہئے اگر نہ آئے گی تو پھر اس زندگی اور سوسائٹی کے اندر ساری وہ خرابیاں پیدا ہوں گی جو ہم آج مغربی تمدن میں دیکھ رہے ہیں، اور اس کا کوئی حل وہاں کے بڑے سے بڑے مفکروں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

"علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں بلکہ اصل سرچشمہ وحی ہے"

علی گڑھ سیمینار میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اختتامی تقریر

۲۵ جنوری ۱۹۸۷ء کو اس سیمنار کا اختتامی جلسہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع صاحب کی صدارت میں ہوا، اس موقع پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) سے اختتامی خطاب کی فرمائش منتظمین جلسہ نے کی، شرکاء جلسہ میں پروفیسر اے، ایم۔ خسرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب بدرالدین طیب جی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی، اور وہ سب فاضل مقالہ نگار موجود تھے جنھوں نے چار روزہ سیمنار میں اپنے مقالات پڑھے اور بحث و گفتگو میں حصہ لیا، ان کے علاوہ یونیورسٹی اور شہر کے متعدد صاحب ذوق اصحاب اور خواتین موجود تھیں۔

مہارت اور اختصاص ضروری ہے

حضرات! میں آپ کی اس عزت افزائی کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے اس علمی مجلس کے افتتاح کے موقع پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا، اب اس کے آخری نشست کے اختتام پر بھی مجھے تقریر کا موقع دیا ہے، آغاز و انجام میں خاص مناسبت ہے، میں آپکے اس اعتماد و اعزاز کے لئے دل سے شکر گذار ہوں، مجھے بڑی مسرت ہے کہ علوم اسلامیہ اور دینی موضوعات سے کچھ عرصہ سے عصری دانش گاہوں کے فضلاء بھی دلچسپی لینے لگے ہیں، اور یہ سیمینار اس کی دلیل ہے، اب علوم اسلامیہ کے ایک خادم اور میدان تحقیق کے پرانے مسافر کو اقبال کے الفاظ میں یہ کہنے کا حق ہے کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

دماغی صلاحیتوں کا خزانہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز نہیں ہے، نہ کبھی مرکوز رہا ہے، اور نہ کبھی مرکوز ہو سکتا ہے، اور ایسا ہونا کچھ اچھا بھی نہیں، اس طبقہ کے لئے خواہ یہ بات کتنی ہی نازش و افتخار کی ہو، لیکن انسانیت کے حق میں یہ کوئی بہتر بات نہیں ہے کہ انسانی ذہانتوں کا خزانہ اور محنتوں کا ذخیرہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے آپ سب جانتے ہیں کہ اسلام میں علمائے دین کا کوئی مخصوص موروثی طبقہ نہیں ہے، کلرجی (CLERGY) اور پریسٹ ہڈ (PRIESTHOOD) کا تخیل مسیحی دنیا میں

ملتا ہے، اس کا دنیائے اسلام میں کہیں وجود نہیں، اگر ہمارے بعض اہلِ قلم مصنفین کی تحریروں میں کچھ ایسی تعبیرات اور الفاظ آتے ہیں تو بے سوچے سمجھے یا مغرب کی تقلید میں، مثلاً اس وقت عرب مصنفین کے یہاں "رجال الدین" کا ایک لفظ استعمال ہوتا ہے، جو تقریباً اسی معنی میں ہے جو مسیحی دنیا میں پرسٹ ہوڈ (PRIESTHOOD) کے لئے استعمال ہوتا تھا، اس لئے محتاط مصنفین نے جو اسلام کی صحیح روح اور صحیح فکر کی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں، ان لفظوں سے ہمیشہ احتراز کیا ہے، لیکن علوم اسلامیہ کی طرف عصری دانش گاہوں کے فضلاء کی توجہ پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بھی میں یہ اضافہ کروں گا کہ کلرجی (CLERGY) اور پریسٹ ہڈ (PRIESTHOOD) اسلام میں نہیں ہے لیکن ایکسپرٹ (EXPERT) اور اسپیشلسٹ (SPECIALIST) ماہرین فن اور اصحاب اختصاص کا وجود ہمیشہ رہا ہے اور یہ ایک علمی حقیقت ہے اس لئے کہ علوم اتنے پھیل گئے ہیں، اور ان میں اتنا تنوع اور وسعت پیدا ہوگئی ہے کہ ایک آدمی کے لئے ہمہ داں ہونا عملاً ناممکن ہے، یورپ میں بھی ترقی اس وقت سے شروع ہوئی جب وہاں تقسیم کار کے اصول پر عمل کیا گیا، اور علوم کے مختلف شعبے تقسیم ہوگئے، اور اس کی کوشش مغربی فضلاء نے چھوڑ دی کہ وہ تمام علوم میں تھارٹی اور سند کا درجہ حاصل کریں، جہاں تک مجھے علم ہے یورپ میں اب بھی اس اصول کا احترام مشرق سے زیادہ کیا جاتا ہے، وہاں کسی علم کے فاضل بھی بعض اوقات اس علم کے بعید متعلقات کے متعلق بغیر کسی شرم وندامت کو محسوس کئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارا موضوع نہیں، اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیں اس کو اصول کے تحت تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہماری آئندہ دلچسپیاں

اور ہماری علمی اور تصنیفی سرگرمیاں کسی خاص موضوع یا فن کے ساتھ مخصوص ہوں گی۔

معیار کی طرف توجہ کی ضرورت ہے

مجھے خوشی اور فخر ہے کہ میں آپ کا ہم سفر ہوں ہم سفری کے اس حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کے سامنے چند باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں آپ اس کو کسی تعریض پر محمول نہ فرمائیں، پہلی بات جسے میں محسوس کر رہا ہوں اور آپ میں سے بہت سے لوگ محسوس کر رہے ہوں گے، بہت سے سینئر اسکالرز یہاں موجود ہیں جن کے ۳۰۔۴۰ برس اس صحرا نوردی میں گذرے ہوں گے کہ علم و تحقیق کا معیار روز بروز گھٹتا جا رہا ہے، مجھے یورپ کے سفروں میں بھی اس کا احساس ہوا اور میں نے بعض فضلا سے بھی سنا وہاں بھی اوریئنٹل ازم کا جہاں تک تعلق ہے یعنی مشرقی مباحث پر لکھنے کا اس کا معیار فروتر ہو گیا ہے، اور وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ جتنی محنت اور جیسا عشق اور لگن گذشتہ نسل کے فضلاء میں تھی، اس میں کمی ہے، اس کے پیچھے بہت سے عوامل اور FACTORS کام کرتے ہیں، کچھ سیاسی ہیں کچھ معاشی ہیں۔

استشراق کی ترقی کا راز

ہر علم کے پیچھے بعض بہت طاقتور محرکات ہوتے ہیں، ان عوامل و محرکات نے اوریئنٹل ازم کو ایک زمانہ میں چوٹی پر پہونچا دیا تھا، فرکس اور ٹگنا لوجی یا اکنامکس کے چند دائروں کو چھوڑ کر جہاں تک علمی اور نظری مباحث کا تعلق ہے، اوریئنٹل ازم کو جو یورپ میں اعزاز حاصل تھا،

مستشرقین اور ان کی کتابوں کی جس طرح قدر ہوتی تھی، وہ کم علوم کو حاصل تھی، یہاں تک کہ ادبیات اور لسانیات کے علوم کو بھی شاید وہ درجہ نہیں دیا جاتا تھا، اس کے پیچھے ایک بہت بڑا عامل یا FACTOR کام کر رہا تھا، ہم کو خوشی ہونی چاہیئے کہ اب وہ باقی نہیں رہا، وہ تھا استعمار، مشرق کے سب سے زیادہ سرسبز و شاداب ممالک بدقسمتی یا خوش قسمتی سے سلمانوں کے زیر اثر تھے، ان پر مغرب کی للچائی ہوئی نگاہیں پڑ رہی تھیں۔

استعمار نئی نئی نوآبادیاں (COLONIES) قائم کرنا چاہتا تھا، اس لئے وہاں کے قومی مزاج اور خصوصیات اور ان کی خوبیوں سے زیادہ کمزوریوں سے واقف ہونے کی ضرورت تھی، اس کے لئے مستشرقین ایک ہراول دستہ (PIONEER) کا کام کرتے تھے، ان کے پیچھے حکومتوں کی سرپرستی تھی، بڑے بڑے فنڈ اور بڑے بڑے ادارے تھے، اور ان کا اکرام بادشاہ اور صدر جمہوریہ کے دربار میں بھی ہوتا تھا، یہ FACTOR عرصہ ہوا کمزور پڑ گیا ہے۔

دوسرا معاشی عامل FACTOR تھا، اس پر بھی کچھ اثر پڑا ہے، معاشی ڈھانچہ میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں ہیں کہ اب وہ انعام ملنا مشکل ہے جو پہلے ملتا تھا۔

علم کا عشق

تیسری چیز جو زیادہ توجہ کے قابل ہے، اور اس کو میں اصل سمجھتا ہوں وہ ہے، علم کا عشق جو ہماری پہلی نسل میں تھا، ایک لگن اور خود فراموشی کی کیفیت جو اس عہد میں تصنیفی اور تحقیقی کام کرنے والوں پر طاری رہتی تھی۔

یہ بات کسی خاص دانشگاہ یا جامعہ کو سامنے رکھ کر نہیں کہہ رہا ہوں، یہ میرا عام مطالعہ ہے، تقریباً سب جگہ یہ محسوس کیا جارہا ہے (اور یہ بدقسمتی کی بات ہے) کہ علم سے عشق جو ہمارے اسلاف میں پایا جاتا تھا، اسلاف سے مراد مسلمانوں ہی کے اسلاف نہیں بلکہ گذشتہ نسل میں پایا جاتا تھا، وہ اب بہت کم نظر آتا ہے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی کتاب "علمائے سلف" جو انھوں نے اسی علی گڑھ میں لکھی ہے اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ علم کا عشق اس وقت کے مصنفین اور محققین کے دلوں میں کیسا موجزن تھا اور آج اس میں کس قدر نمایاں انحطاط ہوا ہے، یہ انحطاط کیوں ہوا؟ اس کا تعلق سیاسیات، معاشیات، ادبیات اور اخلاقیات سب سے ہے، اس کے پورے اسباب کا تجزیہ کرنا اس وقت نہ ضروری ہے اور نہ اس کی گنجائش ہے لیکن اتنی بات آپ تسلیم کریں گے اور ہمارے معزز شرکاء کار اور ہم سفر ضرور اس کو تسلیم کریں گے کہ علم سے عشق، شمع علم پر پروانگی کی کیفیت علم و تحقیق کا ایسا جنون کہ کھانے پینے، کپڑے کا ہوش نہ رہے آج مفقود بلکہ معدوم نظر آتا ہے، علماء سلف کے واقعات کو چھوڑ دیجئے اسی علی گڑھ میں جو علماء پیدا ہوئے، مولانا لطف اللہ علی گڑھی ان کے اس عشق کو دیکھئے اور اس کو بھی آپ چھوڑ دیجئے، اس وقت کے مغربی مصنفین کے یہاں "لین" (LANE) جس کا عربی لغت انگریزی دانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عربی ادب کے ان فضلاء کے لئے بھی قابل استفادہ ہے، جو تفصیلات میں جانا چاہتے ہیں، اور وہ مواد یکجا دیکھنا چاہتے ہیں، جو بعض اوقات بہت سے عربی لغتوں میں بھی نہیں ملتا، میں نے سنا ہے کہ قاہرہ میں جب وہ

اس لغت کا کچھ حصہ تیار کر رہا تھا تو مہینوں گذر گئے وہ کہیں نہیں گیا اس کو پتہ نہیں تھا کہ بازار کہاں ہے، بازاروں میں جانے اور اہرام مصر جیسے عجائبات عالم کو دیکھنے کی فرصت نہ تھی، اس کو آپ بد مذاقی یا مردہ دلی پر محمول کر سکتے ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے، بہت سی لازوال اور لافانی تصانیف کی تاریخ اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے مصنفین پر خود فراموشی کا عالم طاری تھا، یہ وہ چیز تھی جس نے مغرب و مشرق کے مصنفین کے قلم سے وہ زندہ جاوید تصانیف اور ایسی تحقیقات نکلوائیں (جن سے اختلاف کے باوجود) ان کی علمی قدر و قیمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ماضی قریب کی علمی شخصیتیں

میرا روئے سخن خالص اپنے ان دوستوں سے ہے، جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں، مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مولانا شبلی نے کتب خانہ اسکندریہ پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی، ایک زمانہ تھا جب ہندوستان میں مشترک دانشگاہوں میں پڑھنے والے مسلمان طلباء کو چڑھانے کے لئے صرف یہ کہنا کافی تھا: "اچھا آپ اس نسل، اس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، جس کے خلیفہ نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلوا دیا تھا" ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے وہ زمانہ پایا ہے، وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم لوگ منھ چھپاتے تھے، بلکہ منھ چراتے تھے، اور آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے کہ اس کا کیا جواب دیں، ایک چلی ہوئی کہانی تھی کہ حضرت عمرؓ کو لکھا گیا کہ یہاں ایک کتب خانہ ہے، جو ظہور اسلام سے پہلے کا ہے، اور اس میں فلاسفہ کی

اور منطقیوں کی کتابیں ہیں تو انھوں نے کہا کہ اگر وہ قرآن کے مطابق ہیں تو اس کی ضرورت نہیں اگر خلاف ہیں تو اس کو آگ لگا دینی چاہیئے چنانچہ لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ قرآن کے خلاف ہیں، اور بغیر پڑھے کتب خانے کو آگ لگا دی، یہ ایک کہانی تھی جس کو ٹائن بی (TOYNBEE) جیسا مؤرخ تک دہراتا ہے، ٹائن بی (TOYNBEE) نے جب رسم الخط کی تبدیلی اور کمال اتاترک کی اصلاح پر تبصرہ کیا تو اس نے کہا اب کتب خانہ اسکندریہ کو جلانے کی ضرورت نہیں صرف رسم الخط بدل دینا کافی ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس پر قلم اٹھایا، اور اس افسانہ کو آخری طور پر ختم کر دیا اب کسی پڑھے لکھے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ یہ کہے کہ کتب خانۂ اسکندریہ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ان کے حکم سے جلایا گیا، انھوں نے قدیم مؤرخین کی شہادتوں سے ثابت کر دکھایا کہ کتب خانہ اسکندریہ حضرت عمرؓ کی خلافت سے پہلے ہی جل چکا تھا، اس کا کہیں وجود ہی باقی نہیں تھا، مثلاً انھوں نے جزیہ کے مسئلہ پر قلم اٹھایا تو اس بحث ہی کو ختم کر دیا، انھوں نے "شعر العجم" لکھی تو اہلِ ذوق اور فارسی دانوں سے اپنا لوہا منوا لیا، پروفیسر براؤن (PROF. BROWN) (جن کی کتاب "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" اپنے موضوع پر GOSPEL کا درجہ رکھتی ہے، اور دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل تھی) نے کہا کہ مجھے اب اردو سیکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے تو اس لئے کہ میں براہ راست "شعر العجم" کا مطالعہ کر سکوں، یہ سب اس علمی شغف اور علمی استغراق کا نتیجہ تھا، جو ان لوگوں پر طاری تھا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ جن کا اصل موضوع قرآن مجید، سیرت نبویؐ اور تاریخ اسلام

تھا، انھوں نے "عمر خیام" پر ایک ایسی کتاب لکھی جس کی داد فضلائے ایران نے بھی دی، اسی طرح ان کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" محنت و کاوش اور ریسرچ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

میں اس موقع پر "نزہۃ الخواطر" کا بھی ذکر کروں گا، جو میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی تصنیف ہے، اور عربی میں آٹھ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی، اس میں ہندوستان کے ساڑھے چار ہزار مشاہیر اور اہلِ کمال کے تذکرے ہیں، انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں اس کام کا بیڑہ اٹھایا، جب عربی مطابع کا رواج اور اشاعت کی سہولتیں نہیں تھیں، تقریباً ۲۵ سال وہ اس کام میں مشغول رہے، اس وقت یورپ میں بھی یہ کتاب ہندوستانی علماء و فضلاء کے حالات معلوم کرنے کا سب سے بڑا ماخذ ہے، اسی طرح ان کی دوسری کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" جو ہندوستان میں علوم اسلامیہ اور نصاب درس کی تاریخ اور ہندوستانی علماء کی تصنیفات کی مکمل ڈائرکٹری ہے، اس کتاب کو دمشق کی رائل اکیڈمی "المجمع العلمی العربی" نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا، میں نے وہاں کی علمی مجلسوں میں بڑے بڑے فضلاء کو اس کی تعریف اور مصنف کی محنت کا اعتراف کرتے ہوئے پایا۔

علم محنت بھی ہے اور انعام بھی

ایک آدمی اس وقت وہ کام کرتا تھا جو ایک اکیڈمی اس وقت انجام نہیں دیتی، یہ سب ایک آدمی کی محنت کا نمود، ایک آدمی کی محنت کا کرشمہ اور ایک آدمی

کے علم سے عشق کا نتیجہ ہے آج اکیڈمیاں، بڑے بڑے ادارے اور شعبے موجود ہیں، لیکن سالہا سال میں وہ کوئی ایسی پیش کش نہیں کر پاتے جس کو دیکھ کر اس علم کے ماہر یہ کہیں کہ ہاں یہ اوریجنل (ORIGINAL) چیز ہے بعض کتابیں دیکھ کر غالب کا وہ مصرع پڑھنا پڑتا ہے۔ ؏

اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

محنت کے معیار کو بڑھانے کی ضرورت ہے، علم محنت بھی ہے، انعام بھی ہے، پیاس بھی ہے، پانی بھی، بھوک بھی ہے، غذا بھی۔

جب تک اپنے فن سے اتنا تعلق نہ ہو کہ آدمی کو کتاب لکھنے پر اتنی خوشی ہو کہ وہ کہے اب مجھے اس ڈیپارٹمنٹ کا چیرمین بنایا جائے یا نہ بنایا جائے، میں نے اپنا کام کر دیا، میری محنت وصول ہو گئی۔

آج کے فضلاء اپنی کتاب اور تحقیق کو مکمل نہیں کر چکتے کہ وہ اس کے انعام کے متوقع ہو جاتے ہیں، سب کی نگاہیں عہدے اور منصب کی ترقی، شہرت و ناموری اور تنخواہوں کی بیشی پر لگی ہوئی ہیں، اور ان کی ذہانت و توجہ کا بڑا حصہ اسی مقصد پر صرف ہوتا ہے، آپ بہت سے ISMS سے واقف ہیں، ایک نئے ISM کا اضافہ کر لیجیے، جو ہماری دانش گاہوں اور تعلیمی مرکزوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے، اور وہ ہے CAREERISM (کیریریزم) یعنی CAREER کو بہتر بنانا اور تقرب اور علم کے ذریعے جاہ طلبی۔

دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو

دوسری چیز یہ کہ یہ دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو مثلاً کسی سیمنار کے لئے ہم کسی موضوع کو اپنے اوپر تھوڑی دیر کے لئے طاری کرلیں پھر اس کے بعد جیسے جگالی کی جاتی ہے، پڑھ کر ہم اس کو اگل دیں اور نہ ہمیں اس موضوع سے محبت ہو اور نہ وفاداری ہو نہ فکر ہو کہ اس سلسلے میں کیا ہوا، نہ اس میں اضافہ کرنے کا شوق ہو، اس موقع پر اقبال سے مدد لیتا ہوں انھوں نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے کہ ؎

مقصودِ ہُنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

علم اور تحقیق بھی ایک ہُنر ہے، اور اس ہنر کو زندگی بھر کا ساتھ دینا چاہئے، اس میں مقصدیت پیدا ہونی چاہئے وہ مثلِ شرر نہیں کہ بھڑکا اور بُجھ گیا۔

علومِ اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں

جہاں تک علومِ اسلامیہ کا تعلق ہے آپ بیشک اجتہاد کی ضرورت پر مقالے پڑھیں ہم سب اس کو تسلیم کرتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اس کا دروازہ بند ہو جانے کے اسباب کیا تھے، اور کہاں تک جائز تھے لیکن میں ایک بات کہوں گا جہاں تک علومِ اسلامیہ کا تعلق ہے، اس کے کچھ سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں، بلکہ ان کا اصل سرچشمہ وہی ہے،

اس لئے ہمارا طرز عمل ان کے بارے میں وہ نہ ہونا چاہیئے جو ایک غیر مسلم مستشرق (ORIENTALIST) کا ہوتا ہے کہ ہم صرف بحث کریں اور ہمیں نہ اس سے کوئی دلچسپی ہو، نہ اس سے اتفاق ہو، ایک حد تک اتفاق بھی ہونا چاہیئے اور اگر وہ ایمانیات سے تعلق رکھتا ہے تو اس پر ایمان بھی ہونا چاہیئے اور کسی حد تک ہماری عملی زندگی میں اس کی نمود بھی ہونی چاہیئے، میں اپنے بچپن میں ایک حکیمانہ مقولہ سنا کرتا تھا کہ "یک من علم را دہ من عقل باید" ایک من علم ہو تو دس من عقل ہونی چاہیئے ورنہ آدمی اس کا صحیح استعمال نہ کر سکے گا، تو میں یہ ترمیم کروں گا کہ تحقیق کی کسی بڑی سے بڑی مقدار کے ساتھ کسی تناسب سے تقوی بھی ہونا چاہیئے، اس لئے کہ یہ مسئلہ علوم اسلامیہ کا ہے جس کا تعلق ایمانیات سے ہے، اگر ہم اس پر اس طرح عمل جراحی کرتے ہیں، جیسا کسی مردہ لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے تو یہ مناسب نہیں تنقید میں کسی قسم کی توہین یا تضحیک کی نشان نہیں ہونی چاہیئے کہ طنزیات و تضحیک کو خالص علمی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں، آپ کا اپروچ APPROACH خالص علمی SCIENTIFIC خالص اکیڈمیک ACADEMIC ہو۔

جو لوگ علم کی ذمہ داریوں اور تحقیقات و نظریات کی تغیر پذیری سے واقف ہیں، وہ اپنے کسی علمی نظریے یا تحقیق کے پیش کرنے میں جزم و وثوق اور قطعیت کے الفاظ استعمال کرنے سے احتراز کرتے ہیں، وہ اپنے کسی نئے خیال کو اس طرح نہیں پیش کرتے کہ وہ گویا اس موضوع پر حرف آخر اور تمام پچھلی تحقیقات پر خط نسخ پھیر دینے والا

ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے اس وقت کے مطالعہ اور تحقیق نے اس نتیجہ تک پہونچایا ہے، ممکن ہے کہ آئندہ اس میں تبدیلی کرنی پڑے یا کوئی نئی بات ثابت ہو، یا مجھے اندیشہ ہے کہ یہ بات اس طرح ہو، مجھے بدر الدین طیب جی کا یہ جملہ پسند آیا جو انھوں نے کل ایک نشست کی صدارت کرتے ہوئے ایک مقالہ نگار سے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا وقت ختم ہو گیا ہو (I AM AFRAID YOUR TIME IS OVER) وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ حضرت آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے لیکن انھوں نے اس کو بڑے لطیف انداز سے ادا کیا، ہم اس سے سبق لے سکتے ہیں، قلم پکڑیں تو آپ کو اول سے آخر تک علم کا احترام اور اس شخص کا احترام بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے جس نے اپنا وقت صرف کیا، جس نے اپنی آنکھیں خراب کیں، جس نے اتنا مواد فراہم کیا۔

عربی زبان کی اہمیّت

عربی زبان کی اہمیت بنیادی چیز ہے، اگر آپ کو علوم اسلامیہ پر کوئی کام کرنا ہے تو یہ بڑے ڈس کلیفکشن (DISQUALIFICATION) کی بات ہوگی آپ عربی سے نا آشنا ہوں، قرآن، حدیث اور اسلامیات پر لکھنے والے بہت سے مشرقی اور مغربی فضلاء سے عربی نہ جاننے کی وجہ سے نادانستہ ایسی غلطی ہو جاتی ہے، جو بعض اوقات ان کے پورے علمی کارنامے پر پانی پھیر دیتی ہے۔

مجھے ایک دوست نے بتایا کہ دہلی میں کوئی سیمنار ہو رہا تھا، اس میں ایک صاحب

جنھوں نے انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا تقریر کررہے تھے تو مشہور عرب ادیبہ اور مورخہ عائشہ بنت الشاطیؒ نے جو اس سیمینار میں شریک تھیں ان سے عربی میں خطاب کیا تو انھوں نے بے تکلفی سے کہا کہ میں عربی نہیں سمجھتا تو عائشہ نے کہا کہ قرآن مجید کا ترجمہ پھر آپ کیسے کرتے ہیں؟ اس کے بعد وطن جاکر انھوں نے مصر کے کثیر الاشاعت اخبار "الاہرام" میں اس پر کئی قسطوں میں مضمون لکھا کہ "میں نے عجائبات عالم میں سے ایک عجیب چیز یہ دیکھی کہ ایک فاضل نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور وہ عربی سے ناواقف تھا۔"

آپ حضرات آسانی کے ساتھ اس پر قابو پاسکتے ہیں، اور عربی زبان میں وہ دسترس حاصل کرسکتے ہیں جس سے آپ غلطیوں سے بچ سکیں، اس سلسلے میں عربی مدارس آپ سے بھرپور تعاون کریں گے۔

انتشار انگیزی سے احتراز کیجئے

بعض فضلاء اپنے نظریات وتحقیقات کے اظہار میں بہت عجلت سے کام لیتے ہیں، ان کی اشاعت ہوجاتی ہے، پھر وہ کچھ عرصہ بعد خود ہی ان سے رجوع کرلیتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنا اخلاقی فرض انجام دیتے ہیں لیکن جو لوگ اس عرصہ میں ان نظریات وتحقیقات کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں، ان کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یہ مسئلہ اور زیادہ سنگین ہوجاتا ہے، جب اس کا تعلق ایمانیات اور عقائد سے ہو، اس لئے ہمیں اپنی تحقیقات کی اشاعت وتبلیغ کے بارے میں (خاص طور پر جب ان کا تعلق

عقائد اور دینیات سے ہو) عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لینا چاہئے، ان پر بار بار غور کرنا چاہئے، ان کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے، ماہرینِ فن کے سامنے پیش کرنا چاہئے، اور ان کی رائے اور مشورہ کا انتظار کرنا چاہئے، پھر اس کے بعد اس کی اشاعت کی اجازت دینی چاہئے، یہ دورِ انتشار ہے، اس وقت طبیعتیں انتشار انگیزی کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں، انسان ہمیشہ سے سہولت پسند اور حیلہ جو واقع ہوا ہے، جدید تمدن نے، سائنسی ترقی کی رفتار نے اور معیارِ زندگی کی بلندی نے اس کو زیادہ سہولت پسند اور انتشار پسند بنا دیا ہے، اس لئے ہم ایسی بات کہنے سے احتراز کریں جس سے لوگوں میں انتشار پیدا ہو۔

۱۹۶۷ء میں جب عربوں کو اسرائیل کے مقابلہ میں شکست فاش ہوئی تو میں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اس میں بہت بڑی ذمہ داری ان تشکیک پسند ادباء اور مصنفین پر ہے، جنھوں نے ہماری جدید عرب نسل کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا، تمام قدیم اقدار کو انھوں نے متزلزل کر دیا۔

میں شکر گذار ہوں وائس چانسلر صاحب، پرو وائس چانسلر صاحب، پروفیسر حقی صاحب اور ان سب حضرات کا جو اس سیمینار سے تعلق رکھتے ہیں کہ انھوں نے مجھے عزت بخشی اور بڑے اعتماد کا اظہار کیا، میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اس سیمینار میں کہا، مخلصانہ کہا۔

خدا کرے کہ میں بھی اس سے فائدہ اٹھاؤں اور آپ بھی اپنے جوہر اور کمالات میں اضافہ کریں۔